ڈاکٹر غلام محمد

قرآنی نگاہ میں تاریخ کا مقام

یہ مقالہ ڈاکٹر غلام محمد صاحب، خلیفۂ مجاز علامہ سید سلیمان ندوی نے "محاضراتِ قرآنی" کے خصوصی اجلاس منعقدہ اکتوبر ۸۲ء میں پیش کیا۔

© rasailojaraid.com

تاریخ کے معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کی بے اعتنائی کا یا تو یہ عالم رہا کہ اس کو دینی نصاب سے خارج رکھا گیا اور علمائے دین اس کے شغل کو اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے رہے یا پھر وہ وقت آیا کہ ایک طبقہ نے اس کی طرف توجہ کی تو اس کے درجہ کو بڑھا کر دینی مسلمات کے پرکھنے میں حجت و برہان کے رتبہ تک پہنچا دیا

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اس افراط و تفریط سے بچنے اور تاریخ کے صحیح مقام اور اس کی افادیت کے دائرہ کی تعیین کے لئے ہم قرآن پاک ہی سے رجوع کرتے ہیں کہ وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً (نحل۔ ۸۹) کی صفت سے متصف ہے۔

قرآن گو صحیفۂ تاریخ نہیں مگر اس میں اُممِ سابقہ کے حالات، ان کے عروج و زوال کے اسباب اور خود ان واقعات کے ذکر کرنے کی غرض و غایت کو جابجا واضح کیا گیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسلام جس کی دعوت اس ادعاء سے اُبھری ہو کہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (التوبہ ۳۲) اور جس کے داعیوں کو یہ حکم ملا ہو کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (سورہ انفال۔ ۳۹) اس کی کتاب ہدایت میں جینے کے گر اور مرنے کے اسباب کی گرہ کشائی نہ کی گئی ہو، اسی لئے ہماری کوشش ہے کہ ہم اسی شمع ہدایت کو لے کر تاریخ کے مقام کا تشخص دریافت کریں اور افراط و تفریط سے بچ کر نقطۂ اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا

اہمیت | تاریخ کی اہمیت کے لئے قرآن پاک میں اور آیتیں موجود نہ بھی ہوتیں تو صرف اس [illegible] تاریخ کی اہمیت کے اظہار کے لئے نہایت کافی تھا۔ وَالْعَصْرِ

© rasailojaraid.com

کا مفہوم ہی یہ ہے کہ "زمانہ کی خود اپنی داخلی حقیقت و تصور اور دن رات کے خارجی تجربات و مشاہدات" انسانی کی غور و فکر نقطۂ تاکیدی قرار پا رہے ہیں۔ صاحب روح المعانی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے العصر کے معنی 'نوائب الدھر' ہی کے نقل کئے ہیں یعنی تاریخ روزگار یا حوادث زمانہ ___ مگر قرآن پاک نے محض اس قسم یا شہادت ہی پر بس نہیں کیا بلکہ تاریخ کی اہمیت جتلانے کے لئے تاریخ دانی اور تاریخ بیانی کی تاکید ہر مبلغ دین کو کر دی کہ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ۔ (ابراھیم ۵)

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ "اَيّٰمِ اللّٰهِ" سے مراد حق تعالیٰ کے انعامات اور اس کی طرف سے آنیوالے ابتلاآت ہیں۔ دوسری جگہ انہیں نے اور مقاتل، الربیع اور ابن زید نے صاف صاف فرما دیا کہ اس سے مراد امم سالقہ کے واقعات ہیں اور علامہ زمخشری کا ارشاد ہے کہ اہل عرب اس لفظ کا استعمال ہی "وقائع" (جس کو ہم اپنی بولی میں تاریخ کہتے ہیں) کے لئے کرتے ہیں ___ لہٰذا اب تاریخ کی اہمیت بلا تاویل ثابت ہوگئی، ایک اور جگہ قرآن مجید میں تاریخ پر توجہ رکھنے کی تاکید اس انداز سے فرمائی گئی ہے کہ

تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ — ہم عزت و نکبت کے دنوں کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔

یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والے اس بات کو سمجھ لیں کہ یہ عروج و زوال کسی اندھیری بہری "مشیت تاریخ" کا اثر نہیں بلکہ اس کے بندھے ٹکے ربانی ضوابط ہیں، جن کو سمجھ کر مسلمان زوال سے محفوظ اور عروج سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن پاک نے تاریخی آثار کی تلاش و تحقیق اور ان میں غور و فکر کرکے عبرت حاصل کرنے کی بہت ترغیب دلائی ہے، ارشاد ہے۔

فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ

(آل عمران)

بہرکیف تاریخ کی اہمیت قرآنی نگاہ میں معلوم ہو چکی، اب ذرا یہ سمجھتے چلیں کہ قرآن پاک کا تاریخی اسلوب کیا ہے اور کیوں ہے؟

اسلوبِ قرآنی کی حکمت

قرآن چونکہ اصلاً صحیفۂ تاریخ نہیں ہے، اس لئے تاریخ عالم کا احاطہ اس کے ذمے نہیں۔ اس میں تو صرف اطرافِ عرب

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کے چند پیغمبروں اور "بیس تیس اقوام و اشخاص سے زیادہ کا تذکرہ نہیں"[1]۔ اور یہ تذکرہ بھی مثلاً قوم عاد و ثمود یا قوم لوط و بنی اسرائیل کا تفصیلی بیان نہیں بلکہ ان کے جستہ جستہ واقعات جن کے وقوع کے نہ ماہ و سال کا تعین ہے، نہ جن کے بیان میں تاریخی ترتیب ملتی ہے، البتہ ان قوموں کے بناؤ اور بگاڑ اور عزت و نکبت کے ظاہری اسباب اور معنوی علل کو جا بجا بیان کیا گیا ہے ـــــ قرآن پاک نے یہ اسلوب تین وجہ سے اختیار کیا ہے، ایک تو اس لئے کہ لوگ اس کو "ہدایت" و "فرقان" کے بجائے تاریخ کی کتاب نہ سمجھ بیٹھیں اور دوسرے اس لئے کہ اگر اس میں تعین سن و سال کے ساتھ واقعات مندرج ہوتے تو یہ جزئیات بھی لازمۂ ایمان بن جاتیں جس کا کوئی نفع تذکیرِ آخرت اور اصلاحِ حال میں حاصل نہ ہوتا، اب یہ اسلوب بیان خود اس امر کی دلیل محکم بن گیا کہ ان واقعات سے قرآن کا مقصود صرف تذکیر ہے [illegible] ـــــ یہ رہبری ملی کہ تاریخ کو سبق آموزی اور عبرت پذیری کا ذریعہ بنائے رکھنا چاہیے، یہی اس کی افادیت ہے، تیسری حکمت اس اسلوب کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن اپنے پڑھنے والوں کے ذہن میں اس بات کو راسخ کرنا چاہتا ہے کہ اس کا منشاء ان تاریخی اجزاء کے بیان سے یہ ہے کہ ان واقعات سے متعلق کر کے جو اسباب و علل ظاہری ہوں کہ معنوی، بے نقاب کئے گئے ہیں ان پر مسلمانوں کی نظر متحکم رہے اور اسباب و علل کی اس دنیا میں وہ ان سے غفلت برت کر خسارے میں نہ پڑ جائیں، ہمارے اس خیال کی تائید میں قرآن پاک کا یہ انتباہ کافی ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ	تحقیق کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں
حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ	بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف
(الرعد)	نہیں بدل لیتی

اس ضمن میں یہ نکتہ بھی ذہن میں محفوظ کر رکھنے کے لائق ہے کہ جس طرح آیات قرآنی کے مطالب اور مفاہیم ان کے شانِ نزول سے متعلق ہو کر محدود و محصور نہیں ہو جاتے بلکہ شانِ نزول کا علم صرف اعانتِ فہم کا فائدہ رکھتا ہے، اسی طرح قرآن پاک نے جن جن پیغمبروں، قوموں، بستیوں یا اداروں سے متعلق کر کے اجتماعی عروج و زوال کے اسباب و علل بیان کئے

---

[1] ارض القرآن (علامہ سید سلیمان ندوی) زیرِ عنوان "تاریخ ارض القرآن"

© rasailojaraid.com

ہیں وہ بھی ان واقعات سے متعلق ہو کر وقتی اور محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں آفاقیت اور دوام کی شان ہے اسی لئے ان کا معلوم کرنا اور رہتی دنیا تک برتنا ضروری ہے۔ مثلاً مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے لئے صرف یہی کافی نہیں وہ نماز روزہ، حج، زکوٰۃ کے پابند رہیں بلکہ قومی بقا اور سربلندی کے لئے قرآن اس بات کو ضروری ٹھہراتا ہے کہ انمیں اتفاق و اتحاد، ایثار وحدتِ مطلب، جوشِ جہاد اور ولولہ اعلائے کلمۃ اللہ کی روح کارفرما رہے، وہ ظاہری اسباب سے بے اعتنائی نہ برتیں مگر اسباب پر بھروسہ کے بجائے ذاتِ حق پر تکیہ رکھیں، اس تعلیم جامع سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے، مثال کے لئے سورۂ انفال کی اکسٹھویں اور باسٹھویں آیات کے دو اجزاء پیش ہیں، حکم ربانی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ	اپنی استطاعت بھر جو کچھ جمع کر سکو مہیا رکھو
قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ	سامان حرب اور پلے ہوئے گھوڑے تاکہ
بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ	اس کے ذریعہ اللہ کے اور تمہارے دشمن
اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ	اور دوسرے اعداء پر دھاک بیٹھ جائے۔

آگے فرمایا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا	اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو تو تم بھی اس
وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ	کے لئے آمادہ ہو جائیے اور اللہ پر بھروسہ رکھو

حاصل مطلب یہ ہے کہ اگر جینا ہے تو تدبیر و توکل کو ایک ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔

؎ چارہ کن پس تکیہ بر جبار کن

قرآن کے نظریۂ تاریخ کی وسعت

اس کے باوجود کہ قرآن کا اسلوب تاریخ کا تفصیلی بیان نہیں ہے پھر بھی اس کے نظریۂ تاریخ کی وسعت کو کوئی غیر نہیں پہنچ سکتا۔ آسوالڈ اشپنگلر (OSWALD SPENGLER) نے جو یورپ کے مادی انقلاب سے متاثر تھا ہر دور کو ایک وجودِ عضوی (ORGANISM) قرار دے کر اس پر تمدن کے عروج و زوال کے اصول وضع کئے، ہیگل نے ذرا کچھ اونچا ہونے کی کوشش کی۔ اس نے تاریخی ارتقاء کو ایک ایسا جدلی عمل (Dialectical Process) قرار دیا۔ جس کی محرک "روحِ عالم" (World spirit) کو قرار دیا اور کہا کہ یہی "روحِ عالم" اپنے ارتقاء کے لئے دنیا میں سب کچھ کرا رہی ہے اور جتنی تاریخی شخصیتیں

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہیں وہ دراصل روحِ عالم کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ انہیں اپنے حصول مقصد کے لئے کام میں لاتی رہتی ہے لے خود یہ روحِ عالم کیا ہے ؟ اس کی حقیقت نامعلوم ہی رہی ۔ بہر حال پھر کارل مارکس نے ایک نظریہ تاریخ پیش کیا جس طرح سگمنڈ فرائیڈ کے ہاں سارے جذبات انسانی اور ان کی نمود کے آثار کا پرکار " جنس " کے نقطہ پر گھوم کر دائرۂ حیات بناتا ہے ، اسی طرح کارل مارکس کے ہاں حیات انسانی کی ساری ہماہمی کا محرک محض " پیٹ " ہے ۔ اس لئے اس نے ہیگل کے جدلی عمل کی بنیاد مادیت میں بھی محض معاش پہ رکھ کر نظریۂ تاریخ پیش کیا جس کی تعریف اینجلز نے یوں کی کہ " مارکس نے انسانی تاریخ میں اس قانون کو معلوم کیا اور ایسی بدیہی حقیقت کا پتہ لگایا جو نظری بحثوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی —— ایک بے بصر کی دوسرا محرم نظر اس کے سوا اور تعریف کر بھی کیا سکتا تھا ، ورنہ مارکس کی یافتِ حقیقت کو تیر اندھیرے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

تاریخ کا سچا اور صحت بخش نظریہ قرآن اور صرف قرآن نے پیش کیا ہے ، وہ انسانی تاریخ کے ابتدائی سرے کو مادیات میں نہیں بلکہ عالم ارواح میں پہنچا ہوا اور تخلیق انسانی کے مرحلۂ اوّل سے جڑا ہوا دکھلاتا ہے ، ارشادِ قرآنی ہے :-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۤئِكَةِ اِنِّیْ — وہ وقت قابل ذکر ہے جب تیرے رب
جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً — نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ
(بقرہ ، ۳۰) — بنانے والا ہوں ۔

اور فرمایا :

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ — جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں
مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ — اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے
(الحجر ، ۲۹) — آگے سجدہ میں گر جانا ۔

پھر جب وہ خاکی پتلا جیتا جاگتا آدم بن گیا اور اپنی ذریت کے ساتھ اس نے اسی عالم ارواح میں بزم سجالی تو خالق و مالک نے سب سے پوچھا " اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟ " (کیا

لے ہیگل : " فلسفۂ تاریخ "

© rasailojaraid.com

میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) تو بھری بزم سے نعرۂ شوق بلند ہوا " بَلٰی شَهِدْنَا "
(اعراف، ۱۸۱) کیوں نہیں، آپ ہی ہمارے رب ہیں اور ہم اس پر گواہ ۔

اس طرح توحیدِ خالص کو ارتقائے تاریخِ انسانی کا نقطۂ آغاز اور قوتِ محرکہ بنایا گیا اور قرآن نے بتلایا کہ " روحِ عالم " نہیں بلکہ " روحِ حق " اور " مشیئتِ تاریخ " نہیں بلکہ " مشیئتِ حق " سارے دائرہ امکان میں جاری و ساری اور کارفرما ہے اور اسی لئے حق کی اطاعت اور مرضئ حق پر پوری زندگی کو وقف کر دینا حیاتِ انسانی کی کامرانی ہے پھر یہ بھی بتلا دیا کہ مادی اسباب و علل کا جو جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے اس کے پیچھے معنوی اسباب و علل بھی ہیں جو زیادہ مؤثر اور قوی ہیں اور تاریخی ارتقاء میں ان کا زیادہ دخل ہے۔

مثلاً سورۂ اعراف میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ارشادِ ربانی ہے ۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا	اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور
وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ	تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین
مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ	سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے،
كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا	مگر انہوں نے جھٹلایا۔ لہٰذا ان کے
كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ	اعمال کے بدلے میں ہم نے انہیں
(الاعراف: ۹۶)	پکڑ لیا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک مادہ کو روح سے متعلق اور دنیا کو آخرت سے مربوط کر کے انسانی فلاح و بربادی کے اسباب و علل کو بیان کرتا اور تاریخ سازی میں ان کو دخیل قرار دیتا ہے ۔ اور یہ صرف اسلام ہی کا طغرائے امتیاز ہے کہ یہاں فرد و اجتماع کا وہ امتزاج رکھا گیا ہے جسمیں اجزائے ممتزجہ اپنی انفرادیت مٹا نہیں بیٹھتے۔

تاریخی استفادہ کا دائرہ

مذکورہ نظریہ کو سمجھنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ قرآن پاک کی افادیت کو تذکیر اور عبرت پذیری کے دائرہ میں محصور رکھنا چاہتا ہے، سورۂ صٓ میں قوم نوح، عاد، ثمود، فرعون، قوم لوط اور اصحاب اَئیکہ کی طغیان شعاری کے مختصر ذکر کے بعد حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کا قدرے تفصیلی ذکر آیا ہے ـــــــــ مگر قہر و مہر کے مستوجب ان لوگوں کے قصص کا ذکر کرنے سے پہلے ہی ذہنِ انسانی میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے اور قسم سے اس کو مؤکد

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کر دیا گیا ہے کہ :-

صٓ وَالقُرآنِ ذِی الذِّکرِ — صٓ۔ قسم ہے قرآن کی جو نصیحت کرنے والا ہے۔

اور پھر ختم پر بھی مزید اس حقیقت کو راسخ کر دیا گیا ہے کہ

اِن ھُوَ اِلَّا ذِکرٌ لِّلعَالَمِینَ — یہ قرآن تو ایک نصیحت نامہ ہے تمام جہان والوں کے لئے

اور دیکھئے قرآن پاک میں سورۂ یوسف ہی وہ سورۃ ہے جس میں ایک پیغمبر کے حالات بچپن سے آخر عمر تک تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور اس تفصیل کے دوران نفسِ انسانی کی آمادگی اور اس سے رونما ہونے والی خرابیاں، اللہ کی طرف سے آزمائش پر آزمائش اور اس میں مردِ حق آگاہ کی پامردی اور اس پر ربانی انعامات کا ظہور، سب ہی کچھ آگیا ہے، مگر اس سب کا حاصل آخر میں یہ جتلایا گیا ہے کہ :

لَقَد کَانَ فِی قَصَصِھِم عِبرَۃٌ لِّاُولِی الاَلبَابِ (یوسف: ۱۱۱) — تحقیق کہ اگلے لوگوں کے واقعات میں اہل عقل کے لئے عبرت کے سامان ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ تاریخ دانی کا حاصل قرآن یہ چاہتا ہے کہ سبق آموزی اور عبرت پذیری رہے۔ اسی منشاء کی تائید میں بے شمار آیتوں کے منجملہ ایک آیت ہے جو سورہ ہائے یوسف، روم، مومن، انفال اور ملائکہ میں دہرائی گئی ہے اور وہ یہ ہے۔

فَیَنظُرُوا کَیفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِینَ مِن قَبلِھِم — (کاش) انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے۔

اس سے بھی یہی بات معلوم ہوئی کہ تاریخ کا اصل فائدہ عبرت حاصل کر کے اپنی زندگی کو بربادی سے بچانا ہے۔

بلند حوصلگی کا قیام

تاریخ کے مذکورہ فائدہ کے علاوہ اس کی ایک اور افادیت کی صراحت بھی ہمیں قرآن پاک میں ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے اہل قوم وملت میں بلند حوصلگی اور ہمت وعزیمت کے قیام کا فائدہ بھی اٹھانا چاہیئے۔

سورۂ ھود میں پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے :-

وَکُلًّا نَّقُصُّ عَلَیکَ مِن اَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِہٖ فُؤَادَکَ — (اے محمدؐ) اور پیغمبروں کے حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان سے ہم تمہارے دل کو ثابت ر

© rasailojaraid.com

وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (هود : ۱۰۰)

مستحکم کرتے ہیں اور ان قصص میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا اور یہ مومنین کے لئے نصیحت و عبرت ہے۔

اس آیت میں "مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ" کا افادہ بہت توجہ طلب ہے۔ اسلام کے شاندار ماضی کی یاد اہلِ اسلام کی رگوں میں عزمِ نو کی لہر یقیناً آج بھی دوڑا سکتی ہے اور ان کی گراوٹ کے ادوار کو نگاہوں میں لانا عبرت اور حمیّت دینی کی بیداری کا محرّک بن سکتا ہے۔

بس یہ حدود ہیں تاریخ کی افادیت کے اور یہی اوج ہے اس کے رتبہ کا، اس سے آگے تاریخ کو دین کے مسلّمات کے مقابل لانا اور تاریخ پر حقائق دینی کو پرکھنا، یہ قرآن نافہمی کا نتیجہ ہے۔

تاریخ کو دین میں حجیت کا درجہ حاصل نہیں

وجہ اس کی یہ ہے کہ تاریخ کو قطعیت کا رتبہ کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکا اور نہ ہو سکتا ہے۔ مشاہدہ کی غلطی، زاویۂ نگاہ کا فرق، قیاس کی انفرادیت وغیرہ ایسے عوامل ہیں کہ ایک ہی واقعہ جمِ غفیر کی نگاہوں کے سامنے ظہور پذیر ہوتا ہے اور بیان کرنے والوں کی تعبیرات مختلف ہو جاتی ہیں، ہمارے دور کے قریبی حوادث میں گاندھی جی کی موت، بہادر یار جنگ اور لیاقت علی خان کی شہادت یا حیدر آباد کا سقوط اور ہندوستان کی تقسیم اور دو سلطنتوں کا الگ الگ قیام بہ ظاہر نہایت بدیہی واقعات ہیں، لیکن ان موضوعات پر جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں تعبیرات کا فرق محرکات کے تعیّن کا اختلاف، ذمّہ داری کا الزام اور فتحیابی کا سہرا باندھنے میں اہلِ قلم کس قدر مختلف ہو گئے ہیں۔ پھر جو بات آج کی تاریخ کی ہے وہی صدیوں پہلے کے حوادث کی تاریخ کی ہے۔ شہادت عثمان ذوالنورین ہو یا نصبِ خلافتِ علی مرتضیٰ، جانشینی یزید بن معاویہؓ ہو یا شہادت حسین ابن علیؓ وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کسی عنوان کے مؤرخانہ بیانات کو قطعیت کا درجہ کہاں حاصل ہے؟ اسی لئے حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ "تاریخ بھی کوئی حجّت ہے؟ تاریخ کا اعتبار ہی کیا۔ اگر کوئی تاریخ کو دلیلِ صحیح کے مقابلہ میں پیش کرے گا تو ہم سے کہیں گے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ تاریخ صحیح ہے[1]

---

[1] ملفوظاتِ یومیہ۔ ملفوظ نمبر (۴)

© rasailojaraid.com

خیر یہ تو عقلی دلیل ہوئی، ہم کو تو قرآن پاک ہی سے تاریخ کی بے اعتباری کا سبب معلوم کرنا ہے۔ دیکھئے حضرت موسٰی علیہ السلام، فرعون کے دربار میں داعیٔ حق بن کر پہنچتے ہیں، فرعون ان سے پہلا سوال ربوبیت مطلقہ کے بارے میں کرتا ہے اور اس کا جواب پا کر بلا جرأتِ تردید دوسرا سوال کرتا ہے جو سورۂ طٰہٰ کی اکاونویں آیت میں یوں نقل ہوا ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ؟ — بولا، پھر کیا حقیقت ہے پہلی نسلوں اور قوموں کی ؟

مطلب یہ ہے کہ ذرا پچھلی تاریخ کے چند اوراق قطعیت کے ساتھ سنائیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ حکیمانہ جواب دیتے ہیں: قرآن نے اپنی شہادت کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے کہ :

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسٰی۔ — بولے، اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتہ میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ بہکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔

معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کے علم قدیم میں چونکہ بہک جانے اور بھول چوک کا احتمال محالِ عقلی ہے۔ اس لئے ان کی بات اٹل ہے اور چونکہ اس کے سوا ہر غیر میں یہ قباحت موجود و مشاہد ہے اس لئے کسی غیر کی بات پائدار اور لائقِ اعتبار کامل طور پر ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا "تاریخ" کو قطعیت کا رتبہ نہیں مل سکتا اور اس بے اعتباری کے نقص کے ساتھ اس کو دین کی دلیلِ قطعی کے مقابل لانا محض اپنی فہم و فراست کا مذاق اڑانا ہے ——

علامہ ابنِ خلدون نے اس آیت پاک سے استشہاد کئے بغیر ہی تاریخ کی بے اعتباری اور اس میں جھوٹ سچ کی آمیزش کے چھ اسباب اپنے گرانقدر "مقدمہ" میں بیان کئے ہیں، یہ اور اس نہج کے اور جتنے اسباب معلوم کئے جاسکیں وہ سب قرآن پاک کے دو لفظی بلیغ اظہار سے باہر نہیں ہوسکتے۔ —— یورپین مؤرخین کے ادعائے تاریخی کا سب سے بڑا سبب کتبات اور آثار ہیں، مگر یہ بھی قطعی ہو نہیں سکتے، اس کی وجہ صاحب اصح السیر (ابو البرکات مولانا عبدالرؤف دانا پوری) نے اپنے قیمتی مقدمہ میں خوب بیان کی ہیں۔ کہ "یورپ نے تاریخ امم کی تحقیق کا ایک جدید طریقہ جاری کیا ہے یعنی کتبات و آثار وغیرہ سے وہ مختلف ملکوں کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں، ایسی مرتب کردہ تاریخ کا جہاں شرائع

© rasailojaraid.com

سے تعلق ہو، وہاں بالکل اعتبار کے قابل نہیں ہیں، اگرچہ اس کو صحیح معلومات کا بہت قوی ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اس کے کئی وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کا انتظام زیادہ تر ایسے ہاتھوں میں ہے جو اصولاً مذہب ہی کے خلاف ہیں، دوم کتبات و آثار کو اس طریقِ تحقیق کی بنیاد قرار دی جاتی ہے مگر اس بنیاد پر فرضی اور قیاسی نتائج کی ایک عمارت تیار کر لی جاتی ہے۔ اور قیاسات میں ہمیشہ تغیر و تبدّل ممکن ہے، سوم کتبات و آثار جس پر اس عمارت کی بنیاد ہوتی ہے اس میں بہت دھوکا ہو سکتا ہے، چہارم جدید کتبات اور جدید آثار کا دریافت کرنا دوات اور شہرت کا بہت بڑا ذریعہ ہے اس لیے جدید معلومات حاصل کرنے میں بہت کچھ کارستانیاں کیجاتی ہیں۔"

حاصلِ کلام

بس اب واضح ہو گیا کہ عقلاً تاریخ میں قطعیت اور صداقت کاملہ کی صفت نہ تو پائی جا سکتی ہے نہ قرآن ہی اس کو "دینی حجّت" کے درجہ میں قبول کرتا ہے ـــــ قرآن پاک کی نگاہ میں تاریخ گو بہت اہم چیز ہے اور اس کی طرف سے اغماض ضرر رساں ہے مگر اس کی افادیت کا دائرہ تذکیر، درسِ عبرت، اجتماعی امور میں عروج و زوال کے اصولوں کی تلاش، بلند حوصلگی، حمیت ملّی اور سنگینیٔ عزم کے قیام کو محیط ہے! اگر تاریخ کے مقام کا یہ قرآنی تعیّن و تشخّص اپنوں کی نگاہ میں روشن رہتا تو گذشتہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں جتنا لٹریچر شیعیت اور ناصبیت نے پیدا کیا ہے یا آج بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر اچھے اچھے بظاہر غیر شیعی اور غیر ناصبی ذی علم اہلِ قلم کے ہاتھوں نکلتا ہی چلا جا رہا ہے اور جس کی وجہ سے عظمتِ صحابہؓ، ناموسِ اہلبیت بلکہ غور سے دیکھئے تو کارنامۂ نبوت اور صداقتِ اسلام تک مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے، ظہور میں نہ آتا اور اساس ملت ڈھ کر رہ نہ گئی ہوتی ـــــ اور ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف یہ بھی نہ ہوتا کہ تاریخ سے بے التفاتی کے سبب ہمارے لائقِ فخر علمائے کرام خصوصاً مفسّرینِ عظّام سے بعض ضمنی و ذیلی ہی نوعیّت کی سہی، تاریخی اور جغرافیائی غلطیاں جو تفاسیر و تصانیف میں درج ہو گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اہلِ استشراق کو خندہ زنی کا موقع ملتا اور نہ ان تسامحات کو طشت از بام کر کے وہ ہمارے علماء کی ساری کاوشِ علمی کو عام مسلمانوں خصوصاً انگریزی تعلیم یافتگان کی نگاہ میں بے وقعت و ناقابل التفات ٹھہرا سکتے،

ؔ؎ ایں قدر گفتیم باقی فکر کُن!

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com